Z. Ahmed
خیابانِ غالب
مؤلف :- نادمؔ سیتاپوری
مدینہ پبلشنگ کمپنی بندر روڈ کراچی

نادم سیتاپوری

غالبؔ کے متعلق چند غیر معتبر روایات

ناشر

مدینہ پبلشنگ کمپنی بندر روڈ کراچی

پہلا ایڈیشن ———— اپریل ۱۹۷۰ء

ناشر ———— مدینہ پبلشنگ کمپنی بندر روڈ کراچی

مطبع ———— مشہور آفسٹ لیتھو پریس کراچی

قیمت ————

اس پہ گزرے نہ گماں ریو و ریا کا زنہار
غالب برا نہ مان جو واعظ برا کہے
غالب خاک نشین اہل خرابات ہے
یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

عبدالعزیز خالد کے نام
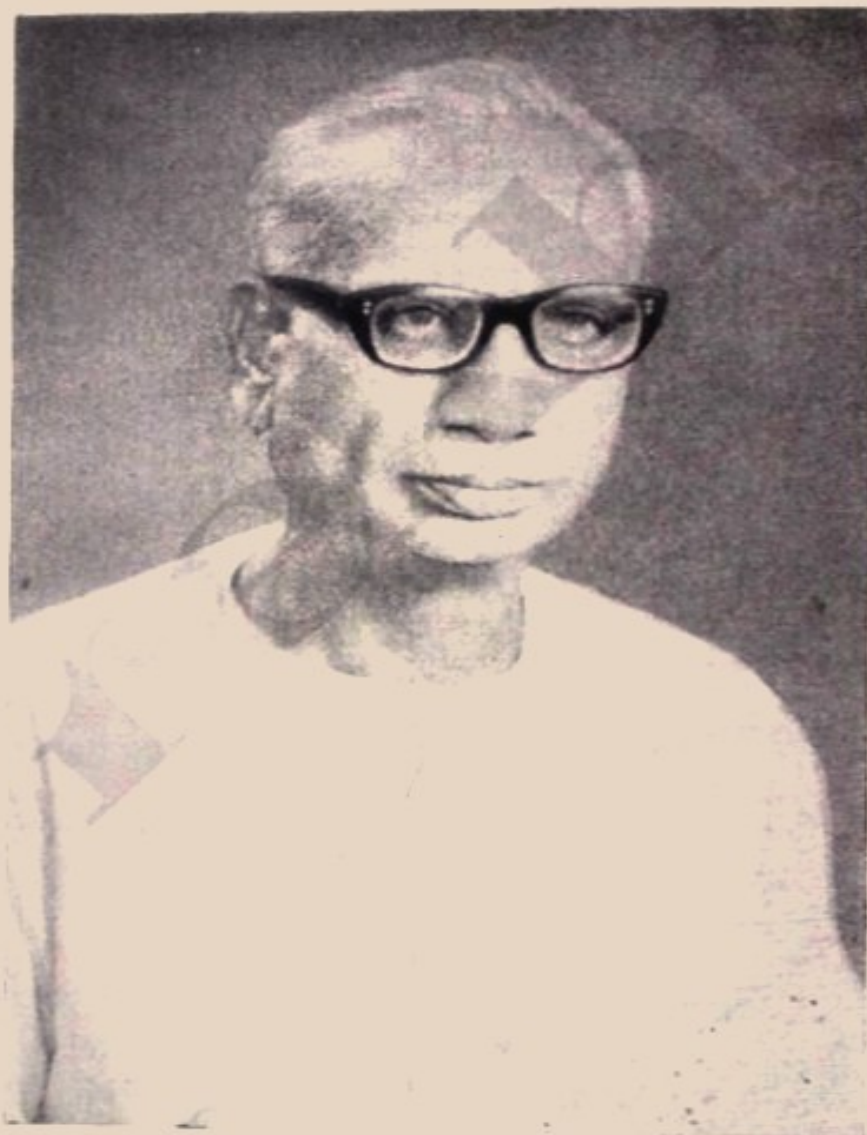
نادم سیتاپوری

نادم سیتاپوری

فہرست مضامین

غالب کے متعلق چند غیر معتبر روایات

غالب کے متعلق چند غیر معتبر روایات

غالب اپنی زندگی میں مقبول رہے ہوں یا نامقبول۔ لیکن ان کی 'ہشت پہل' شخصیت اپنے عہد ہی میں مرکز توجہ بن چکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے 'دامن شہرت' میں گلوں کے ساتھ کچھ خار بھی سمٹ آئے ہیں جنھیں اگر روایت نگاروں کی خوش نیتی سے الگ کرکے روایت و درایت کے اصولوں پر پرکھا جائے تو یہ روایتیں اس میزان پر پوری نہیں اترتیں۔ میں صاحب 'آب حیات' کے کمالِ فن تذکرہ نویسی کا بھی معترف ہوں اور ان کی نیک نیتی کا احترام بھی کرتا ہوں، مگر اس کے باوجود 'آب حیات' کے ان کمزور پہلوؤں کو متوازن تنقیدی جائزوں سے محروم نہیں کیا جا سکتا جن کی زد سے شاید ہی کوئی تذکرہ نگار بچا ہو اس سلسلے میں "آبِ حیات" کا یہ مشہور لطیفہ 'روایت بالمعنیٰ' کے اعتبار سے خواہ کتنا ہی دلچسپ کیوں نہ ہو، پھر بھی صاحب آب حیات نے اس کے سیاق و سباق کی یقیناً کوئی چھان بین نہیں کی اور اس عہد میں جس طرح سنا تھا، من و عن نقل کر دیا۔

> "مولوی فضل حق صاحب مرزا (غالب) کے بڑے گہرے دوست تھے۔ ایک دن میرزا ان کی ملاقات کو گئے۔ ان (مولانا فضل حق) کی عادت تھی کہ جب کوئی بے تکلف دوست آیا کرتا تو خالق باری کا مصرع پڑھا کرتے تھے:
>
> بیا برادر آؤ رے بھائی
>
> چنانچہ میرزا صاحب کی تعظیم کو اٹھ کھڑے ہوئے اور یہی مصرع کہہ کر بٹھایا۔ ابھی بیٹھے ہی تھے کہ مولوی صاحب

(فضل حق) کی 'رنڈی' بھی دوسرے دالان سے
اٹھ کر پاس آن بیٹھی۔ مرزا نے فرمایا، ہاں صاحب' اب
وہ دوسرا مصرع بھی فرما دیجیے۔
بہ نشیں مادر بیٹھ ری مائی" ۵ے

جہاں تک غالب کی بدیہہ گوئی کا تعلق ہے، یہ لطیفہ ان کے کمالِ فن کا عکاس ہے، مگر اس کے ساتھ ہی مولانا 'فضل حق کی رنڈی' کا تذکرہ یقیناً درست نہیں ہے' کیونکہ اس عہد کے سب سے بڑے 'منکر حقائق' مرزا حیرت دہلوی نے اس واقعے کی تفصیلات میں مولانا فضل حق کی 'رنڈی' کا ذکر نہیں کیا ہے، حالانکہ یہ مرزا حیرت دہی ہیں جنھوں نے حضرت شاہ اسمٰعیل شہید سے 'غلو عقیدت' کی بنا پر ایشیا کے اس بڑے منطقی خاندان کی علمی عظمت سے انکار کر دیا تھا۔ اگر انھیں مولانا فضل حق کی اس کمزوری کا پتہ چل جاتا تو وہ 'آبِ حیات' سے زیادہ بڑھا چڑھا کر اسے پیش کرتے۔ مرزا حیرت نے اس لطیفے کو اس طرح نقل کیا ہے:

"کسبیوں کا ناچ ہو رہا تھا اور میرزا نوشہ (غالب) تشریف لائے انکے ایک بھائی نے جو ایک چھوٹی ریاست کے نواب تھے، امیر خسرو کی 'خالق باری' کا میرزا نوشہ کو دیکھ کے مصرع پڑھا:

بیا برادر آ دُ رے بھائی

میرزا نوشہ نے بے ساختہ جواب دیا کہ دوسرا مصرع بھائی تم نے کس کے لئے رکھ چھوڑا ہے۔ بی صاحبہ (یعنی طوائف) کی طرف خطاب کرکے پڑھ دو۔ اس پر مجلس میں بڑا قہقہہ پڑا۔ اور دوسرا مصرع ہے:

بہ نشین مادر بیٹھ ری مائی"

۵ے آبِ حیات، ساتواں ایڈیشن ۱۹۱۳ء، صفحہ ۵۲۸/۵۲۷

(چراغ دہلی صفحہ ۲۳)

صحیح واقعہ کس طرح پر تھا اور کیا تھا۔؟ اس سلسلے میں تقریباً اسی عہد کی ایک روایت اور بھی ملتی ہے جو اس لحاظ سے قریب تر کہی جا سکتی ہے کیونکہ اسکے نقل کرنے والے غالب کی حقیقی بہن چھوٹی خانم کے پوتے سردر جنگ[1] آغا مرزا بیگ ہیں، جھنوں نے کچھ زمانہ اپنے دادا (غالب) کا بھی پایا تھا اور پھر اپنی خاندانی روایات سے انھیں ایک خاص لگاؤ بھی تھا۔ سردر جنگ نے لکھا ہے:

"مرزا غالب کی مولانا فضل حق (خیر آبادی) سے کمال دوستی تھی۔ ہر شب کو مولانا جو سر رشتہ دار ریزیڈینٹ تھے، باہر صحن میں تخت پر بیٹھے ہوئے کچھ مسلیں دیکھ رہے تھے۔ ایک 'رنڈی' بھی اس امر کی منتظر کہ مولانا دیکھ لیں تو سلام کر کے بیٹھ جاؤں، کھڑی ہوئی تھی۔ اس عرصہ میں مرزا (غالب) لالٹین لئے آگے آگے پہنچے۔ مولانا (فضل حق) نے سر اُٹھا کر کہا:

---

(۱) غالب کی حقیقی چھوٹی بہن 'چھوٹی خانم'، دہلی کے سبز پوش، خاندان میں مرزا اکبر بیگ بدخشی کو بیاہی تھیں۔ مرزا جواد بیگ (عرف مرزا مغل بیگ) اُن کے سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے اور سردر جنگ مرزا جواد بیگ کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ غالب کی انھیں بہن، چھوٹی خانم سے ان کے تین بھانجے اور ایک بھانجی امانی خانم تھیں جو نواب علی بخش خان لوہارو کو بیاہی گئی تھیں۔ انکی پوتی سکندر زمانی بیگم سردر جنگ کی اہلیہ تھیں، اس کے علاوہ سردر جنگ کی ساس عزیز النسا مرزا غالب کی حقیقی بھتیجی تھیں، یعنی مرزا یوسف کی اکلوتی صاحبزادی۔ اس لحاظ سے غالب اور سردر جنگ میں تہری رشتہ داریاں تھیں۔ سردر جنگ کے والد اپنے پورے خاندان کو لے کر ۱۸۵۷ء میں سیتاپور چلے آئے تھے جہاں انکے بڑے بھائی مرزا عباس بیگ مستقل طور پر رہ بس گئے تھے۔ سردر جنگ کی ابتدائی تعلیم سیتاپور اور لکھنؤ میں ہوئی، پھر اس خاندان کا بڑا حصہ دکن چلا گیا۔ سردر جنگ نظام دکن آصف جاہ سادس کے استاد تھے۔ زندگی کے آخری ایام میں علی گڑھ آ گئے تھے، یہیں جون ۱۹۳۲ء میں وفات پائی۔ لاش دہلی لے جائی گئی۔

بیا برادر آؤ رے بھائی

مرزا غالب نے کہا۔ دوسرا مصرع بھی پڑھ دیجئے کہ دیر

سے (یہ) منتظر کھڑی ہے۔ دوسرا مصرع یہ ہے:

بہ نشین مادر بیٹھ ری مائی"

غالب کی زندگی میں اُن کا فن ہی نہیں شخصیت بھی ایک ایسی شہرت سے دوچار ہو چکی تھی جس کے پس منظر میں مشتبہ اور مشکوک روایات کا جنم پاجانا کچھ زیادہ تعجب خیز نہیں ہے۔ پھر ان کے مرنے کے بعد تو تعریف سے تنقیص اور مدح سے قدح کے ایسے ایسے پہلو نکالے گئے جن کی مکمل تفصیلات بھی آج نہیں ملتیں۔ غالب کی وفات کے تیس سال بعد جب مجدد السنہ مشرقیہ مولانا سید احمد حسن شوکت میرٹھی کی شرح دیوان غالب چھپی تو اس میں نہ محض غالب کے فن کو شوکت میرٹھی کی تحریفات کا سامنا کرنا پڑا بلکہ شوکت نے بعض جگہ بغیر کسی حوالے کے نہایت ہی مبتذل واقعات کو غالب سے منسوب کر دیا۔ مندرجہ ذیل شعر:

میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے

ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں

کی شرح کرتے ہوئے شوکت میرٹھی تحریر فرماتے ہیں[2]:

"..... ہم کو معلوم ہوا ہے کہ جب مرزا غالب نے یہ شعر مشاعرے میں پڑھا تو ختم مشاعرہ کے بعد مولوی امام بخش صہبائی مرحوم نے جو ایک مقدس اور متورع بزرگ تھے مرزا صاحب سے پوچھا کہ آپ نے اس شعر میں کیا معنیٰ پہنا دیے ہیں۔ مرزا صاحب نے کہا کہ مولانا! آپ اس شعر کے معنیٰ کیا سمجھیں گے، نہ آپ نے رنڈی بازی کی، نہ خانگی بازی، نہ امرد بازی کی، نہ فاعل بنے نہ مفعول،

---

[1] کارنامۂ سروری مطبوعہ مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، حاشیہ صفحہ ۲۰۔

[2] حل کلیات اُردو، غالب دہلوی، شوکت المطابع میرٹھ، اکتوبر ۱۸۹۹ء۔

میں نے تو اپنا ایک واقعہ لکھا ہے۔ یعنی جس 'مسماۃ' پر
میں فریفتہ تھا، بڑی تدبیروں اور چالوں سے اس کو کسی
کونے کھدرے میں ڈھب چڑھایا۔ مگر اس خوف سے کہ
کوئی آ کھڑا ہوگا، رجولیت چوہے کے بل میں گھس گئی مسماۃ
سمجھی کہ غالب محض نامرد اور عنین ہے۔ میں نے معذرت
میں یہ شعر پڑھا"

ایسے مبتذل اور غیر ادبی جھوٹ کی مثال شاید شوکت میرٹھی کے بعد مرزا واجد حسین
یاس عظیم آبادی (یگانہ چنگیزی)، ہی کے یہاں ملے تو ملے، دوسری جگہ ممکن نہیں۔ مرزا یاس
(وفات ۱۹۵۲ء) نے اپنے رسالۂ عروض و قوافی (چراغِ سخن) میں بلا کسی حوالے کے ایک
ایسی ہی من گھڑت حکایت تحریر فرمائی ہے:

"غالب پہ کیا؟ کتنے ہی ہونہار شاعر اس قوت متخیلہ
کی آزادی اور مطلق العنانی کی بدولت گمراہ ہو گئے اور
جتنے جو گمراہ ہوئے وہ اس وقت تک راہ پر نہیں آئے
جب تک قوت ممیزہ کو تخیل پر حاکم نہ بنا لیا۔ ہائے میر
تقی میر! کیا جوہری سخن تھا، مرزا غالب کے شعر سن کر
صاف کہہ دیا کہ اس لڑکے کو اگر کوئی استاد کامل مل گیا
اور سیدھے راستے پر لگا دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا
ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔ وہی ہوا کہ غالب نے کسی کو استاد
نہ بنایا اور نہ راہ راست پر آئے۔ چنانچہ غالب کے
کسی بے تکلف دوست نے یہ شعر پڑھ کر از راہ تمسخر
ان کی بہت تعریفیں کیں۔

پہلے تو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکال
بعد اس کے جز دکل بھینس کے انڈے سے نکال

غالب نہایت آزردہ ہوئے اور کہا۔ نہ معلوم کس مسخرے
نے یہ مطلع میری طرف منسوب کر دیا ہے۔ اس پر ان کے
مہربان نے فرمایا کہ بھئی برا کیوں مانتے ہو، تمہارے شعر
تو ایسے ہوتے ہی ہیں۔"[1]

غالب کے فن اور شخصیت کے سلسلے میں اس قسم کی فرضی حکایتوں اور جھوٹی روایتوں کو خاصی اہمیت حاصل ہے، جنھیں احتیاط و توازن کے ساتھ اگر جانچا اور پرکھا نہ گیا تو غالبیات کے بہت سے گوشے تاریکی میں چلے جائیں گے۔

شوکت میرٹھی اور یاس عظیم آبادی کے بعد اس ضمن میں مفتی انتظام اللہ شہابی مرحوم (وفات ستمبر ۱۹۶۸ء) کا نام لاشعوری طور پر سامنے آجاتا ہے۔ انھوں نے ایسی ہی مشتبہ، مشکوک اور غلط روایات کا ایک "دفتر بے پایاں" چھوڑا ہے۔ ایک کثیر التصانیف مصنف کی حیثیت سے جو اہم ذمہ داریاں ان پر عاید ہوتی تھیں، افسوس کہ وہ کبھی ان کو پورا نہ کر سکے۔ "لطائف الشعرا" مفتی صاحب مرحوم کی ایک مشہور تصنیف ہے جس میں محض غالب ہی کے متعلق نہیں، بلکہ دیگر مشاہیر کے بارے میں بھی جا بجا ایسی فرضی حکایتیں شامل کر دی گئی ہیں جن کا سر پیر نہیں۔ بعض جگہ فرضی کتابوں کے حوالے بھی ہیں لیکن زیادہ تر روایات ایسی ہیں جن کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ غالب کے متعلق جو لطائف اس کتاب میں نقل کیے گئے ہیں ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جو اس سے پہلے قبول عام حاصل کر چکے ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ ساتھ چند لطیفے ایسے بھی ہیں جو بہر قیمت غلط یا مشکوک اور مشتبہ ہیں۔ چند لطیفے ملاحظہ ہوں:

"مرزا غالب نے مولانا غلام امام شہید سے اپنے
خاص ظریفانہ انداز میں دریافت کیا، آپ شہید کب سے
ہوئے اور کیوں کر ہوئے؟ غلام امام نے فرمایا کہ جب سے
'کافر غالب ہوئے'۔ اور مرزا کا یہ شعر لکھ کر بھیج دیا:

---

[1] چراغ سخن، صفحہ ۳۹، مطبع منشی نولکشور لکھنو، دسمبر ۱۹۲۱ء۔

بامن میاویز اے پدر فرزند آذر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر دینِ بزرگاں خوش نکرد

مرزا مسکرا کر رہ گئے ۔" [1]

اسی طرح ایک دوسرے لطیفے (دلی کی ادبی صحبت) میں تحریر فرمایا ہے :-

" حکیم مومن خاں مومن کے یہاں احباب کا مجمع تھا۔ مرزا غالب ، نواب شیفتہ، مفتی صدرالدین آزردہ، حکیم آغا جان عیش سے حضرات شریک صحبت تھے۔ قاضی نجم الدین برق آبادی بھی حکیم صاحب (مومن) سے ملاقات کے لیے حاضر ہوئے ۔ ناسخ لکھنوی کے کلام پر بحث تھی، میر تقی میر کا ذکر آگیا، مرزا غالب فی البدیہہ فرماتے ہیں :

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

عیش کہنے لگے ، استاد ناسخ نے کیا خوب شعر کہا ہے :-

یوں نزاکت سے گراں سرمہ ہے چشمِ یار پر
جس طرح ہو رات بھاری مردمِ بیمار پر

ہر ایک نے توجہ سے سنا اور داد دی ۔ برق سکندر آبادی نے دست بستہ عرض کی کہ حضرت ناسخ نے سرمہ چشمِ یار پر لکھ کر جدت کا ثبوت دیا ہے اور ہم سے نو آموزوں کے لئے اب تو سند ہو گئی اور ادھر استادوں نے توثیق بھی کر دی ۔ حکیم صاحب بولے میاں برق خوب بات پیدا کی اور معقول گرفت ہے ۔" [2]

---

[1] لطائف الشعراء، مطبوعہ فاروقی پریس دہلی صفحہ ۲۳ ۔ [2] لطائف الشعرا صفحہ ۳۰ ۔ ۲۹

یہ تیسرا لطیفہ (ذوق و غالب) بھی اسی رنگ میں ترتیب دیا گیا ہے:۔

" حضرت ذوق اور مرزا غالب میں شاعرانہ چشمک تھی۔ ذوق کا قلعۂ معلی میں طوطی بول رہا تھا بادشاہ کے استاد کیا تھے جگت استاد بنے ہوئے تھے۔ اکثر شہزادے مرزا غالب سے مانوس تھے، مرزا بلانے پر قلعہ جایا کرتے۔ حضرت ذوق کی کوشش رہتی تھی کہ مرزا اسد اللہ خان کا کہیں قلعہ میں پالا نہ جم جائے تو اس کی ریختہ گوئی پر حرف گیری کیا کرتے۔ خضر سلطان کو مرزا سے تلمذ تھا، انھوں نے قلعہ والوں کی باتیں جا لگائیں۔ مرزا فرماتے ہیں:۔

فارسی ہیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است
راست می گویم من واز راست سر نتواں کشید
ہرچہ در گفتار فخر تست آں ننگ من است[۵۱]

اسی قسم کا ایک اور لطیفہ (تازہ نہال) بھی غالب کے ایک شعر سے گڑھا گیا ہے:۔

" مرزا غالب قلعۂ معلی میں جب جاتے تو حضرت سلطان[۵۲] آپ کی بڑی خاطر مدارات کرتا اور جہاں مرزا پہنچے اور اپنے والد ماجد بہادر شاہ سے جا کر کہا۔ مرزا صاحب آئے ہیں۔ حضور بادشاہ سلامت جلد باریابی کا موقع عطا فرما دیتے، ورنہ حضرت ذوق کے مقابلے میں کسی کی دال گلنے والی نہ تھی۔ ایک دن بادشاہ سے

---

۵۱ لطائف الشعراء، صفحہ ۳۱ ۔ ۳۰۔

۵۲ 'حضرت سلطان'، غالباً کتابت کی غلطی ہے 'خضر سلطان' ہونا چاہیے۔

مرزا صاحب (غالبؔ) نے خضر سلطان کے لئے کہا:۔

خضر سلطاں کو رکھے خالق اکبر سرسبز
شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے[۱]"

اور یہ لطیفہ بھی غالباً پہلی بار مفتی انتظام اللہ شہابی مرحوم کی وساطت سے اہل ادب تک پہنچا ہے:۔

"مرزا غالب رام پور گئے ہوئے تھے۔ حضرت جلال (حکیم ضامن علی) مرزا صاحب سے ملنے آئے۔ شراب نوشی میں مصروف تھے، ایک جام مے ناب سے بھر کر جلال کے سامنے پیش کیا، انھوں نے کہا میں نہیں پیتا ہوں۔ مرزا نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا آج تو ابر ہے جلال نے کہا، حضرت مجھے اس سے رغبت نہیں ہے۔ غالب بولے، اجی حضرت ابر بھی ہے، سردی بھی ہے۔ آخر جلال جھلا سے گئے اور کہنے لگے، حضرت میں حرام جانتا ہوں۔ اس پر مرزا مسکرائے اور کہنے لگے، پھر یہ شعر آپ نے کیوں کر کہا:۔

رات مے خوب سی پی صبح کو توبہ کر لی
رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی[۲]"

ان لطائف کے سلسلے میں مفتی انتظام اللہ شہابی مرحوم نے کسی راوی کے حوالے کی ضرورت محسوس نہیں فرمائی اور ان لطیفوں کے سیاق و سباق سے صاف طور پر ظاہر ہے کہ غالبؔ کے مختلف اشعار کو واقعات کا جامہ پہنا کر لطائف کے قالب میں ڈھال دیا گیا ہے۔ اول تو یہ روایات لطیفوں کے انداز میں کہیں دوسری جگہ نظر بھی نہیں آتیں، اور

۱؎ لطائف الشعرا صفحہ ۳۵-۳۶

۲؎ " ۲۹

اگر فرض کر لیا جائے کہ جس التزام کے ساتھ جلال لکھنوی اور غالبؔ کی ملاقات کو قلم بند کیا گیا ہے، کسی حد تک سچ بھی ہو تب بھی اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ غالبؔ نے جلال کا شعر پڑھ کر انھیں لاجواب کر دیا ہو۔

مفتی صاحب مرحوم نے کچھ لطیفوں کے ساتھ مولوی اکرام اللہ گوپاموی کی 'تصویر الشعرا' کا حوالہ بھی دیا ہے مگر یہ تحریر نہیں فرمایا ہے کہ یہ کتاب کب لکھی گئی۔ اور کہاں ہے یا مخطوطے کی شکل میں کس کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اور نہ اس کتاب (لطائف الشعرا) میں مولوی اکرام اللہ گوپاموی کے اس تعلق کو ظاہر فرمایا ہے جو مرزا غالبؔ سے ظاہر کیا گیا ہے "مولوی سید مدد علی تپش" کے عنوان سے لطائف الشعرا" میں اس شعر:۔

ڈیڑھ جزو پر بھی تو ہے مطلع و مقطع غائب
غالبؔ آسان نہیں صاحبِ دیواں ہونا

کو بھی غالب سے منسوب کر دیا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں:۔

"حضرت تپش مرزا صاحب (غالبؔ) کے شاگرد تھے۔ مراسلت سے شاگرد ہوئے تھے۔ دلی مرزا صاحب سے ملنے آئے۔ گھبراہٹ میں دیوان کا صاف شدہ مسودہ بھول آئے۔ ایک دوسرا مجموعہ تھا وہ ہمراہ چلا آیا۔ مرزا صاحب سے اپنے دیوان کا ذکر کیا اور اس مجموعے کو ملاحظے سے گزارا، اس میں بہت تھوڑا کلام انکا تھا باقی دوسروں کا کلام تھا، پوری پوری غزلیں بھی نہ تھیں۔ مرزا صاحب (غالب) نے دیکھ کر کہا۔

ڈیڑھ جزو پر بھی تو ہے مطلع و مقطع غائب
غالبؔ آسان نہیں صاحبِ دیواں ہونا

تپش صاحب نے اس مجموعے کو واپس لے کر دیکھا تو دیوان نہ تھا، دوسرا نسخہ تھا، جلد ایک سی بنی تھی اسے

دھوکا ہوا۔ مرزا صاحب سے بھی معذرت کی اور دوبارہ وہ
دیوان لے جاکر دکھایا اور اصلاح لی۔ یہ دیوان انکے پوتے
منشی عبدالحمید تاج محلی کے یہاں بطور تبرک محفوظ ہے۔"

یہ شعر نہ تو غالب کا ہے، نہ سید مدد علی تپش اکبر آبادی کے دیوان سے اس کا کوئی تعلق ہے۔ بلکہ اس غلط انتساب سے صاف ظاہر ہے کہ اس کے مصرع ثانی میں 'غالب' کے تخلص کو دیکھ کر ایک فرضی حکایت گڑھ دی گئی ہے۔ یہ شعر حقیقتاً عبداللہ خاں اوج کا ہے۔ جس کا ذکر 'آبِ حیات' میں موجود ہے۔

" اوج تخلص، عبداللہ خاں نام۔ ۴۰۔ ۵۰ برس
کے مشاق تھے۔ ایسے بلند مضمون اور نازک خیال پیدا
کرتے تھے کہ قابو میں نہ لا سکتے تھے اور انھیں عمدہ الفاظ
میں ایسی چستی و درستی سے باندھتے تھے کہ وہ مضمون سما
بھی نہ سکتا تھا۔ اس لئے کبھی تو مطلب کچھ کا کچھ ہوجاتا
تھا اور کبھی کچھ بھی نہ رہتا تھا۔ سنگلاخ اور مشکل زمینوں
میں غزل کہتے تھے، فکر مضامین اور تلاش الفاظ میں تن بدن
کا ہوش نہ تھا۔ غور کے ساتھ کاوش کرتے تھے اور آپ
ہی آپ مزے لیتے تھے۔ ہونٹ چباتے چباتے ایک
طرف سے سفید ہوگیا تھا۔ بعض دفعہ پڑھ کر کہتے تھے کہ
آنکھوں سے لہو ٹپک پڑا تھا، جب یہ شعر کہا تھا۔ بعضے
(شعر) پر کہتے تھے کہ چھ مہینے تک برابر پڑھتا رہا۔ پڑھتے
اس زور شور سے تھے کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا ۔۔۔
مشاعروں میں غزل سناتے تھے تو صفِ مجلس سے آگے
نکل جاتے تھے۔ بعض اشخاص شہر میں اور قلعے میں اکثر

۱؎ لطائف الشعرا صفحہ ۴۸۔

مرشد زادے (شہزادے) شاگرد تھے، مگر استاد سب کہتے تھے۔ شعرائے باکمال کو جا کر سناتے تھے، اور واہ واہ کی چیخیں اور تعریفوں کی فغاں و فریاد کر چھوڑتے تھے، کیونکہ اسے اپنا حق سمجھتے تھے۔ ذوق مرحوم باوجود کم سخنی اور عادت خاموشی کے "خوب خوب .... بہت خوب" کہتے اور مکرر پڑھواتے تھے۔ مسکراتے اور چہرے پر سرور ظاہر کرتے گویا شعر کی کیفیت میں بیٹھے ہیں۔ اور میرزا (غالب) تو ایسی دل لگی کے مصالحے ڈھونڈھتے پھرتے تھے کہ۔ 'نعمت خدا دے' شعر سنتے اور کہتے تھے کہ یہ سب کافر ہیں جو تمہیں استاد کہتے ہیں۔ شعر کے خدا ہو خدا! سجدے کا اشارہ کرتے اور کہتے سبحان اللہ! سبحان اللہ۔ میں ان دنوں میں مبتدی شوقین تھا۔ اپنا مشتاق سمجھ کر مجھے بہت خوش ہوتے تھے کہ بس تم ہمارے کلام کو سمجھتے ہو۔ رستے میں مل جاتے تو دس قدم دور سے دیکھ کر کھڑے ہو جاتے اور جو نیا شعر کہا ہوتا اسے وہیں سے اکڑ کر پڑھتے۔ پھر شعر سنتے سناتے چلتے۔ تنے کے نیچے میدان میں گھنٹوں ٹہلتے اور شعر پڑھتے رہتے تھے۔ غریب خانے پر بھی تشریف لاتے اور پہر بھر سے کم نہ بیٹھتے تھے ایک دن رستے میں ملے، دیکھتے ہی کہنے لگے، آج گیا تھا، انھیں (غالب کی طرف اشارہ ہے) بھی سنا آیا۔ میں نے کہا کیا؟ کڑک کر کہا:۔

ڈیڑھ جزو پہ بھی تو ہے مطلع و مقطع غائب
غالب آسان نہیں صاحبِ دیواں ہونا

غالب سے ایک 'نئے شعر' کا انتساب کرتے ہوئے مفتی انتظام اللہ شہابی مرحوم نے ایک واقعے کو دو جگہ کھپانے کی کوشش کی ہے۔ مولانا عرشی رامپوری نے اس کی تفصیل ان الفاظ میں تحریر فرمائی ہے:۔

"یہ شعر مفتی انتظام اللہ شہابی نے 'انشائے بےخبر' کے دیباچے میں اس تمہید کے ساتھ لکھا ہے:

" ایک بار مرزا صاحب دہلی سے آگرے گئے تو نیل کے کٹرے میں مجلسِ احباب منعقد ہوئی۔ مرزا حسام الدین بیگ، خواجہ غلام غوث بےخبر وغیرہ سخن سنج شریکِ مجلس تھے۔ شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ اس زمانے میں فرقۂ اہلِ نشاط سے ایک رقاصہ 'صنم' تھی جس کا شہرہ بہت تھا اور وہ خود بھی فکرِ سخن کرتی تھی۔ وہ بھی شریک مجلس ہوئی، مرزا صاحب (غالب) نے فی البدیہہ (یہ شعر[۱]) ارشاد فرمایا"۔

" اس کے بعد مفتی صاحب (انتظام اللہ شہابی) نے اخبار قومی زبان کراچی بابت یکم دسمبر ۱۸۵۷ء[۲] میں "غالب اور ساحر" کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا، اس میں لکھا ہے کہ:

'مرزا غالب آخری مرتبہ دلی سے ۱۸۳۲ء یا ۱۸۳۶ء میں (اپنے) وطن (آگرہ) آئے، مرزا حسام الدین بیگ خلف مرزا مغل بیگ رئیس برارا کے یہاں چند روز

۱؎ سیہ چوٹی، زرافشاں مانگ، بزاس پر دوشالا ہے
تماشا ہے پرِ طاؤس میں کالے کو پالا ہے

۲؎ یہ ٹائپ کی غلطی ہے، ۱۹۵۷ء ہونا چاہئے۔

مقیم رہے۔ ننھیال میں کوئی نہ رہا تھا، ماموں باندے جا چکے تھے۔ مرزا صاحب کی تشریف آوری پر صحبتِ احباب منعقد کی گئی... صحبت میں مہر (مرزا حاتم علی بیگ) راجہ (راجہ بلوان سنگھ) بے خبر (غلام غوث خاں بے خبر) شیخ احمد علی شیون، میر زین العابدین شورش وغیرہ شریک ہوئے۔ تمام اصحاب جمع ہو گئے تو صنم زرق برق لباس میں آئی، اس پر غضب یہ تھا کہ سبز دوشالہ اوڑھ رکھا تھا، پیشانی پر قشقہ لگا ہوا۔ داخلِ محفل ہوئی۔ ہر ایک کی نگاہ اس پر پڑے بغیر نہ رہی۔ مرزا غالب بے ساختہ کہتے ہیں:

سیہ چوٹی زرافشاں مانگ سبز اس پر دوشالا ہے
تماشا ہے پرِ طاؤس میں کالے کو پالا ہے[۵]"

بلاشبہ یہ شعر غالب کا نہیں ہے، لیکن اگر یہ واقعہ 'انشائے بے خبر' کی روایت تک محدود رہتا تو شاید 'من حیث الواقعہ' ایسی مضبوط گرفت میں نہ آسکتا جتنا 'قومی زبان' (کراچی) کی تفصیلات کے بعد واضح ہو گیا ہے، کیونکہ اس دوسری روایت میں صرف مرزا حاتم علی بیگ مہر کا نام ہی اس کے بے بنیاد ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے مرزا حاتم علی بیگ مہر کا کوئی تعلق کبھی آگرے سے نہیں رہا لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا آبائی مکان آج بھی کٹرہ ابوتراب خاں میں موجود ہے۔ شیخ امام بخش ناسخ کے شاگرد تھے۔ غدر کے بعد جب انگریزوں نے فتح پور سیکری کے پاس دو گاؤں جاگیر میں دئے تو پہلی بار آگرے سے ان کا تعلق قائم ہوا۔ اور اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد مرزا غالب کبھی آگرے گئے ہوں۔ خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی مرحوم تحریر فرماتے ہیں:

"۱۸۵۷ء کے غدر میں سات انگریزوں کو اپنے گھر میں

---

[۵] دیوان غالب، نسخہ عرشی، صفحہ ۲۹۳۔

چھپایا، اس خدمت میں مرزا سخاوت علی بیگ اور مہر
(مرزا حاتم علی بیگ) کے ماموں شریک تھے۔ پھر لکھنؤ
سے ان کو آگرے لیگئے، گورمنٹ سے اس خدمت کے صلے
میں بائیس پارچہ کا خلعت مع مالائے مروارید اور گھوڑا
اور اسلحہ عطا ہوئے اور جاگیر میں دو موضع قریب فتحپور
(سیکری) مرحمت ہوئے۔ اب (مہر نے) اپنا قیام آگرے
میں کر لیا اور وہیں ہائی کورٹ میں وکالت کرنے لگے۔"[۵]

جناب مالک رام نے اس شعر کے سلسلے میں لکھا ہے:

"شرح غالب (صفحہ ۲۹۳) میں جناب عرشی صاحب
نے اس شعر سے متعلق صاحب موصوف (مفتی انتظام اللہ
شہابی) کے دو مختلف مضمونوں کے اقتباس دئے ہیں
دونوں کا مضمون ایک ہی ہے کہ جب مرزا غالبؔ آخری
مرتبہ، آگرے گئے تو وہاں محفلِ احباب میں ایک رنڈی
'صنم'، نامی کو زرق برق لباس میں ملبوس، سبز دوشالہ
اوڑھے دیکھا تو (مرزا غالبؔ نے) فی البدیہہ یہ شعر پڑھا۔
مفتی صاحب نے خلاف معمول اس روایت کے لئے
حوالہ نہیں دیا۔ بہرحال اگر وہ ایسا کرتے جب بھی قابل
قبول نہ ہوتا میں افسوس کے ساتھ یہ ظاہر کرنے پر مجبور ہوں
کہ شاید بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہے کہ مفتی صاحب
روایتیں 'وضع' کرنے میں بہت مشاق ہیں۔ وہ بالعموم
کسی قلمی کتاب کا نام اختراع کر کے اس کی سند دیں گے
کہ یہ کتاب 'مفتیان گوپامؤ' (ضلع ہردوئی) کے کتب خانے

---

[۵] آب بقا، نول کشور پریس لکھنؤ، صفحہ ۱۱۹۔

میں ہے یا آرکاٹ (مدراس) کے شاہی کتاب خانے میں
زینت ہے یا کسی اور جگہ ہے۔ حالانکہ اس کا کہیں وجود
نہیں ہوتا۔ گویا مؤ میں خیر سے کوئی کتب خانہ ہے ہی نہیں
اور جن کتابوں سے متعلق انھوں نے بعض مضامین میں
'آرکاٹ' کا نام لیا ہے۔ تحقیق سے وہ بھی غلط ثابت
ہوا ہے۔ وہ (مفتی صاحب) پچھلے ۲۵ ۔ ۲۰ ۔ برس
سے اس جعل کے مرتکب ہو رہے ہیں اور بہت لوگ
اس سے گمراہ ہوئے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان
کو اس پر متنبہ کیا جائے اور انکی کوئی روایت اس
وقت تک تسلیم نہ کیجائے جب تک کہ یہ کسی دوسری مصدقہ
شہادت سے درست نہ ہو۔ فی الحال اتنے اشارے پر
اکتفا کرتا ہوں۔ میں اس شعر کو محض مفتی صاحب کی
سند پر غالب کا تسلیم کرنے سے انکاری ہوں۔" [۱]

غیر معتبر اور غیر مستند روایات کے سلسلے میں جناب مالک رام نے مفتی انتظام اللہ شہابی مرحوم کا تذکرہ جن الفاظ میں کیا ہے، انھیں الفاظ کی مستحق اسی عہد میں ایک اور شخصیت ہے جسے کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا عبدالباری آسی الدنی مرحوم (وفات ۱۹۴۶ء) اپنے دور کے ان باکمالوں میں تھے جنھیں اگر زمانہ چین سے بیٹھنے کی مہلت دیتا تو شاید آج اُردو ادب کی تاریخ میں وہ ایک ممتاز مقام حاصل کر چکے ہوتے۔ لیکن گردش ایام کی نامساعدت نے انھیں پل بھر کی مہلت نہ دی۔ لکھنؤ پہنچے بھی تو اس دور میں جب 'عزیز و یاس' کی ادبی ہنگامہ آرائیوں کا آغاز ہو چکا تھا' معرکہ چکبست و شرر' کا غبار بھی فضاؤں پر موجود تھا۔ لکھنوی اور غیر لکھنوی کی تلخیاں بھی باقی تھیں۔ اس 'اجنبی دیار' میں زندہ رہنے کے لئے انھیں "نولکشور" کا سہارا لینا پڑا۔

---

[۱] سہ ماہی "فکر و نظر" علیگڑھ، جنوری ۱۹۶۱ء، صفحہ ۱۵۲۔

اُردو اور فارسی کتابوں کی نشر و اشاعت کا شعبہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ قابلِ اشاعت کتابوں کا انتخاب، ان کی ترتیب و تدوین، تشریح نگاری اور حواشی نویسی، سب کچھ انھیں سے متعلق تھا۔ ان کے زمانے میں بیشمار نئی اور پرانی کتابوں کا قابلِ قدر اضافہ ہوا۔ اور نولکشور پریس کو نشاہ ثانیہ نصیب ہوئی۔ اسی زمانے میں نیاز فتح پوری مرحوم 'نگار' کو لے کر بھوپال سے لکھنؤ پہنچ چکے تھے اور مقبول حسین وصؔل بلگرامی بھی لکھنؤ کی بساط ادب پر جلوہ نما ہو چکے تھے۔ وصؔل مرحوم کے یہاں روزانہ نشستوں کا سلسلہ شروع ہوا اور اسی کے ساتھ غالبؔ کے دیوان میں 'نیا اضافہ' ہونے لگا۔ کلام غالب میں کئی سو نئے اشعار شامل کر کے مولانا آسیؔ نے " مکمل شرحِ دیوان غالب " تصنیف فرمادی جسے صدیق بکڈپو لکھنؤ نے ۱۹۳۱ء میں شائع کیا۔

'مکمل شرح دیوان غالب' میں نہ محض غالبؔ کے نام سے جعلی کلام[1] کا الحاق کیا گیا بلکہ کچھ ایسے نئے انکشافات بھی کئے گئے جن سے اہلِ علم و ادب اس وقت تک بے خبر تھے۔ مکمل شرح کے طویل مقدمے میں دو ایسی بیاضوں کی نشاندہی کی گئی جن میں غالب کا غیر مطبوعہ کلام سمویا گیا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس فاضلانہ مقدمے میں بعض ایسی باتیں بھی کہی گئیں جن کا کوئی ثبوت نہیں دیا گیا۔ چنانچہ جناب مالک رام جیسے محقق نے بلا کسی تحقیق کے تذکرہ "تلامذہ غالب" میں صرف مولانا آسی کے بیان کا سہارا لے کر منشی خلیفہ حسام الدین احمد الدنی کو غالب کا شاگرد لکھ دیا جو قطعاً ایک مشکوک و مشتبہ روایت ہے اور روایت و درایت کے جن اصولوں پر پرکھنے کے بعد جناب مالک رام نے مفتی انتظام اللہ شہابی کی روایات کو ماننے سے انکار کیا ہے، مولانا آسی بھی اس میزان پر پورے نہیں اترے۔

'مکمل شرح دیوان غالب' کے اسی مقدمے میں مولانا آسی نے 'آب حیات' کی اس روایت کی تکذیب کرتے ہوئے "کہ غالب کا مروجہ دیوان مولانا فضل حق خیر آبادی اور مرزا خانی خان کا انتخاب کیا ہوا ہے" ایک سخت تنقید کی ہے اور ایک ایسی روایت تحریر فرمادی ہے جس کا کوئی ذکر کہیں نہیں ملتا۔ مولانا آسی نے تحریر فرمایا ہے:

---

[1] ملاحظہ ہو 'غالب کے کلام میں الحاقی عناصر' شائع کردہ 'مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی'۔

"مرزا خانی (خان) ہوں یا مولانا فضل حق (خیر آبادی)
میرا ہرگز یہ خیال نہیں ہے کہ مرزا (غالب) ایسے غیور
طبع نے جگرپاروں کو ان کے حوالے کرکے ان کی زندگی
اور موت کو ان کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا ہوگا، غلط ہے'
یہ اور بات ہے کہ ان دونوں نے صلاحیں دی ہوں
اور مرزا نے ان کی دوستانہ صلاح کو مانا بھی ہو۔ مگر
یہ انتخاب مرزا ہی نے کیا ہے ۔ ۔ ۔ خود میرے والد (خلیفہ
حسام الدین احمد الدنی) مرزا غالب کے دیکھنے والوں
میں تھے، ان کے کمالِ فن کے پورے رازداں تھے ۔
وہ جب آزاد کا یہ 'آبِ حیات والا لطیفہ دیکھتے تھے
کہ مرزا نے مولوی فضل حق سے انتخاب کرایا تو غصے کے
مارے سُرخ ہوجاتے تھے اور فرماتے تھے کہ کیا بہتان
باندھا ہے ۔

"والد صاحب بیان کرتے تھے کہ مرزا اصلاح دیگر
بعض شاگردوں سے ایک ہندو تمبولی کی نسبت
تو ضرور یہ کہتے تھے کہ ذرا اس کو بھی سنا لینا اور باقی
کسی کو وہ کچھ نہیں سمجھتے تھے ۔ صہبائیؔ (امام بخش) کو
ملائے مکتبی، آزردہؔ (مفتی صدر الدین) کو ایک حکمراں،
ذوقؔ کو بادشاہ کا استاد، مومنؔ کو لڑاکو جانتے تھے
اور ذرا بھی ان کی پروا نہ تھی ۔"[1]

قطع نظر اس سے کہ مروجہ دیوانِ غالب کے انتخاب کی نوعیت کیا تھی، مولانا آسی
اپنے والد منشی خلیفہ حسام الدین احمد کے بارے میں کوئی ثبوت اس کا پیش نہیں کر سکے

---

[1] مکمل شرح دیوان غالب، مطبوعہ اشاعت العلوم لکھنؤ، صفحہ ۱۱ ۔ ۹

کہ وہ غالب کے 'کمال فن کے پورے رازداں' تھے۔ غالب کا کوئی ایسا خط آج تک سامنے نہیں آسکا جس میں خلیفہ حسام الدین احمد کا ذکر کسی سلسلے میں آیا ہو۔ جناب مالک رام نے محض مولانا آسی کے خود نوشت حالات (مطبوعہ ماہنامہ نگار لکھنؤ، بابت جنوری فروری ۱۹۴۱ء) کو بنیاد بنا کر خلیفہ حسام الدین احمد کو غالب کا شاگرد اور 'کمال فن کا پورا رازداں' تصور کر لیا۔ حالانکہ انھیں خود نوشت حالات کے جن ٹکڑے پر جناب مالک رام نے یہ عظیم عمارت تعمیر فرمائی ہے، اگر اس کے صرف اسی حصے پر توجہ فرما لیتے تو پوری بات سمجھ میں آجاتی۔ جناب مالک رام نے مولانا آسی کے خود نوشت حالات کا جو حصہ نقل کیا ہے، اس کی ابتدائی سطور یہ ہیں:

"حسام، خلیفہ حسام الدین احمد الدنی۔
ہاپوڑ (ضلع میرٹھ) کے نواح میں 'الدن' ایک قصبہ ہے، وہیں کے ایک شریف خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ شاعری گویا ورثے میں پائی تھی۔ ان کے والد مولوی شیخ خدا بخش بھی شاعر تھے، عاجز تخلص تھا۔ عاجز کے والد شیخ عبدالحکیم عرف میاں نھن عاشق تخلص کرتے تھے۔ یہ میر تقی میر کے ہم عصر اور جلیس تھے، آپس میں خوب صحبتیں رہتی تھیں اور ایک ساتھ شعر و شاعری سے شوق کرتے تھے...." [۱]

جس طرح غالب کے 'کمال فن کے رازدان' (خلیفہ حسام الدین احمد) کا نام یا کوئی شعر آپ کو کسی تذکرے میں نہ ملے گا، اسی طرح تمام قدیم و جدید تذکرے میر تقی میر کے ان 'ہم عصر اور جلیس' سے خالی نظر آئیں گے۔ اگر جناب مالک رام 'کلیات میر' مرتبہ مولانا آسی کے طویل مقدمے میں میر کے ان ہم عصر اور جلیس، کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے تو شاید بلا تصدیق خلیفہ حسام الدین احمد کو غالب کا شاگرد

---

[۱] تلامذۂ غالب، صفحہ ۹۴-۹۳۔

تسلیم نہ کرتے ۔

مفتی انتظام اللہ شہابی مرحوم کی طرح مولانا آسی مرحوم کا ذہن بھی ہمیشہ احساس ذمہ داری سے خالی رہا اور ایسی ایسی روایتیں ان کے قلم سے بیساختہ نکل گئی ہیں جنھیں کوئی غیر تحقیقی ذہن و شعور بھی مشکل سے قبول کرے گا۔ ہندو تمبولی، کا ذکر مولانا آسی نے مذکورہ بالا روایت میں کیا ہے۔ اس کا ذکر آپ کو آزاد کے یہاں ملے گا نہ حالی کے یہاں ۔ غالب کے کسی ہم عصر نے ایسے سخن فہم تمبولی کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ حالانکہ اگر ایسی کوئی باذوق شخصیت دلی میں ہوتی تو آزاد و حالی نہ سہی، خواجہ حسن نظامی مولانا راشد الخیری اور ناصر نذیر فراق جیسے روایت نگار تو اسے کبھی فراموش نہ کرتے ۔

مولانا آسی نے غالب کے اردو کلام میں الحاقی کلام تو شامل ہی کیا تھا، سب سے بڑا ستم یہ ہے کہ ۱۹۲۵ء میں دیوانِ غالب (اردو) کا ایک نیا ایڈیشن نولکشور پریس لکھنؤ سے ایسا شائع کرایا جس میں ایک طرف تو نسخۂ حمیدیہ (مکتوبہ ۱۸۲۱ء مطبوعہ ۱۹۲۱ء) کا ایک انتخاب بھی " انتخاب غزلیات غیر مطبوعہ مرزا غالب مرحوم " کے عنوان سے شامل کر دیا اور نسخۂ حمیدیہ کے حوالے کے بغیر تحریر فرمایا:

> "چونکہ مرزا غالب کی غیر مطبوعہ غزلیں یا وہ کلام جسے غالب نے خود قابل طبع نہ سمجھا تھا، اکثر بیدل اور شوکت، اسیر وغیرہ کے رنگ میں ہیں اور اس وجہ سے وہ بیحد الجھی ہوئی اور بعید الفہم ہیں، لہٰذا ان غزلوں میں سے وہ اشعار انتخاب کیے گئے جو اس رنگ میں بیحد سہل اور آسان ہیں۔ ہمارا ارادہ تھا کہ ان اشعار کو ان کے مروجہ دیوان کی غزلوں میں شامل کر دیا جائے مگر چونکہ خود مرزا نے ان کو علیحدہ کر دیا ہے لہٰذا ہم نے بھی مصنف مرحوم کا اتباع کیا۔" [1]

---

[1] دیوان غالب، ایڈیشن ۱۹۲۵ء صفحہ ۱۱۵۔

دوسری طرف اس دیوان میں حاشیے پر بعض اشعار کی شرح بھی کی گئی ہے۔ اور بے سروپا روایات بلا کسی حوالے کے لکھ دی گئی ہیں۔ ۱۹۲۵ء کے ایڈیشن کا جو نسخہ میرے سامنے ہے اور اس پر سرورق نہیں ہے اس لئے یہ کہنا دشوار ہے کہ اس پر بحیثیت مرتب مولانا آسی کا نام ہے یا نہیں؟ لیکن یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ یہ دیوان مولانا آسی ہی کا ترتیب دیا ہوا ہے اور شرح کے پیرائے میں جن اشعار پر غیر مستند روایات کے حواشی لکھے ہوئے ہیں، وہ سب مولانا ہی کی جدت طبع سے تعلق رکھتے ہیں۔ مولانا آسی مرحوم کے ایک قریبی دوست میرزا محمد عسکری بی۔ اے نے اپنے خود نوشت حالات "من کیستم" میں مولانا آسی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"شاعر و ناقد و شارح، مشہور لولکشور پریس میں
بعہدۂ مصحح و شارح ملازم ہیں، خوشا نصیب پریس
کہ ایسا گوہرِ بے بہا کوڑیوں کے مول مل گیا اور وہ
اس کی قدر نہیں کرتا۔"[1]

اس ایڈیشن میں شرح کے پردے میں جو "روایت سازی" کی گئی ہے وہ دلچسپ بھی ہے اور افسوسناک بھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے ان اشعار کے "پس منظر" میں جھانک کر کچھ تصوراتی خاکے بنا ڈالے ہیں جو اس دیوان کے حاشیوں کے سوا شاید کہیں بھی نظر نہ آئیں گے۔ اب آپ ان اشعار کے آئینے میں وہ روایات ملاحظہ فرمائیں جنھیں بلا کسی مستند حوالے کے اس دیوان غالب میں لکھا گیا ہے:

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

سنا ہے کہ غالب مرحوم نے یہ غزل قلعہ میں پڑھی
تھی۔ بہادر شاہ ظفر مرحوم نے جب یہ مقطع سنا تو
فرمایا کہ ہم تو اس وقت بھی آپ کو ایسا نہ سمجھتے۔ مرزا نے

---

[1] من کیستم، نامی پریس لکھنؤ، ۱۹۴۳ء، صفحہ ۹۶۔

ازراہ شوخی عرض کیا کہ حضور تو اب بھی ایسا ہی کہتے
ہیں مگر یہ اس لئے ارشاد ہوتا ہے کہ میں اپنی حالت
پر مغرور نہ ہو جاؤں۔ (صفحہ ۲۱)

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

ذوقؔ مرحوم اس شعر کو پڑھ کر پہروں سر دھنتے
تھے اور غالبؔ کی تعریف ان الفاظ میں کرتے تھے کہ
غالبؔ کو اپنے اچھے شعروں کی خود بھی خبر نہیں ہوتی۔
(صفحہ ۲۹)

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

مولانا آزردہؔ کبھی غالبؔ کے کسی شعر کی تعریف
نہیں کرتے تھے۔ ایک دن کسی نے اچانک یہ
شعر پڑھا، اور شعر میں صفائی کو پسند کرتے تھے۔
ایک دن کسی نے اچانک یہ شعر پڑھا، پھڑک گئے
اور پوچھا یہ کس کا شعر ہے؟ کسی نے کہا۔ غالبؔ کا
شعر ہے۔ جواب دیا کہ پھر اس میں مرزا کی کیا تعریف
ہے، یہ تو ہماری روش خاص ہے اور اس کے مستحقِ
ستائش ہمیں ٹھہرتے ہیں۔ (صفحہ ۵۴)

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے

ذوق مرحوم کہیں پالکی میں بیٹھے جا رہے تھے غالب کی نظر پڑی، چونکہ ان سے ہم عصرانہ چشمک تھی، انھوں نے یہ مصرع فی البدیہہ کہہ کر پڑھا۔ ذوق مرحوم نے سن لیا اور بادشاہ سے شکایت کی۔ بادشاہ نے غالب کو بلوایا اور پوچھا کہ آج آپ نے کونسی غزل کہی ہے انھوں نے پوری غزل سنائی۔ آخر میں مقطع میں یہ مصرع شامل کر کے سنا دیا۔ (صفحہ ۹۱)

اس قسم کی متعدد روایات اس دیوان کے حاشیوں پر لکھدی گئی ہیں جن کے بارے میں کوئی قابل اعتبار ثبوت یا حوالہ نہیں دیا گیا ہے۔ جو مکالمات ان روایات میں درج کئے گئے ہیں یقیناً بے بنیاد اور من گڑھت ہیں۔

مولانا آسی کے مرتبہ دیوان غالب اردو کا ایک ہی ایڈیشن جون ۱۹۲۵ء میں نولکشور پریس لکھنؤ نے شائع کیا تھا کہ ۱۹۴۲ء میں مولانا کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بعد مولوی امیر حسن نورانی (رکن شعبۂ طباعت دہلی یونیورسٹی) ان کے قائم مقام کی حیثیت سے نولکشور پریس کی راجہ رام کمار برانچ میں پہنچ گئے۔ ان کے زمانے میں اس دیوان غالب کے دو ایڈیشن ۱۹۵۷ء اور ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئے جن کے سرورق پر مولوی امیر حسن نورانی کا نام اس التزام کے ساتھ چھپا ہوا ہے کہ "مع تصحیح و اضافہ حالاتِ زندگی" لیکن سوائے اس کے کہ مولانا آسی کے لکھے ہوئے حالات میں ردوبدل کیا گیا ہے، باقی ان ایڈیشنوں میں سب کچھ وہی موجود ہے جو مولانا آسی نے لکھا تھا۔ یہاں تک کہ ۱۹۵۷ء کے ایڈیشن میں صفحہ ۱۱۵ پر "انتخاب غزلیات غیر مطبوعہ غالب مرحوم" کی خوش خبری ۱۹۶۰ء کے ایڈیشن میں بھی موجود ہے اور صفحات ۱۲۴ و ۱۲۵ پر غالب کا مشہور 'سہرا' شائع کرنے کے بعد لکھا گیا ہے کہ:

"یہاں تک 'غزلیں' دیوان غالب کی تمام ہوئیں۔
اب آگے قصائد اور قطعات ہیں۔"

مولانا نورانی کے تصحیح کیے ہوئے ایڈیشنوں میں بھی یہ تمام فرضی حکایات بدستور موجود ہیں، کہیں ایک نقطے کا فرق نہیں۔ نسخہ حمیدیہ کو چھپے ہوئے نصف صدی سے زیادہ زمانہ ہوگیا۔ اس کے نہ جانے کتنے انتخابات شائع ہو چکے مگر مولانا نورانی کے نزدیک یہ آج بھی ایسا نادر ذخیرہ ہے جس کی دریافت کا سہرا انھیں کے سر ہے۔